اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ

(از افادات حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ)

(۳)

مترجمہ جناب مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی

عدم تقلید کا زمانہ اب یہ بات معلوم کرنی چاہیے کہ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں کسی مخصوص مذہب فقہی کی تقلید پر لوگ متفق نہ تھے، چنانچہ ابو طالب مکی اپنی کتاب "قوت القلوب" میں فرماتے ہیں:۔

"لوگوں کی یہ (فقہی) تصنیفات اور تالیفات نوپید کی چیزیں ہیں۔ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں لوگوں کے اقوال (بطور حجت شرعی) پیش کرنے کا رواج نہ تھا اور نہ یہ قاعدہ تھا کہ کسی ایک ہی شخص کے مذہب پر فتوی دیا جائے، ہر مسئلہ اور معاملہ میں اسی کی رایوں کو اختیار اور بیان کیا جائے اور اسی کے مذہب کو مدار یقین قرار دے لیا جائے۔"

بلکہ لوگوں کا حال اس کے بالکل برعکس تھا۔ اس وقت لوگوں کے دو طبقے تھے، ایک طبقہ علماء، دوسرا طبقہ عوام۔ عوام کا حال یہ تھا کہ وہ اُن اجتماعی اور اصولی مسائل میں، جو تمام مسلمانوں یا عام ارباب اجتہاد کے درمیان متفق علیہ تھے، براہ راست شارع علیہ السلام ہی کی تقلید کرتے تھے (نہ کہ کسی امام مجتہد کی)۔ اور وضو و غسل کے طریقے اور نماز و زکوٰۃ وغیرہ کے احکام یا تو اپنے بزرگوں سے سیکھ لیتے، یا اپنی بستیوں کے اصحاب درس و تدریس سے، اور اسی کے مطابق خود عمل کرتے۔ اور جب کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آتا تو جس مفتی کو پاتے، بلا لحاظ مسلک و مذہب، اسی سے فتویٰ پوچھ لیتے۔ ابن ہمام اپنے رسالہ "التحریر" کے آخر میں لکھتے ہیں:

"لوگ کبھی ایک عالم سے فتویٰ پوچھتے کبھی دوسرے عالم سے، ایک ہی مفتی سے فتویٰ پوچھنے کا التزام نہ تھا۔"

رہے علما تو ان کے دو گروہ تھے:

ایک گروہ ان علما کا تھا جنھوں نے کتاب وسنت اور آثارِ صحابہ کی تلاش (وتحقیق) میں پوری کاوش فکر صرف کر کے، بالقوۃ ___ ایسی بالقوۃ جس کو بالفعل ہی کہنا چاہیے ___ اتنی استعداد بہم پہنچائی تھی کہ عوام کے سامنے ایک (صاحب علم ونظر) مفتی کی حیثیت سے آ سکیں، ایسے صاحب فکر ونظر مفتی کی حیثیت سے، جو مسائل کا جواب بالعموم دے سکے اور جس کو توقف سے دوچار ہونے کی نوبت کم ہی پیش آئے۔ یہ لوگ مجتہد مطلق کہے جاتے ہیں۔

یہ استعداد (اجتہاد) دو طرح حاصل ہوتی ہے: کبھی تو اس طرح کہ ہر امکانی کوشش صرف کر کے روایات کو جمع کیا جائے۔ کیونکہ احکام کا ایک بڑا حصہ احادیث میں، اور ایک بڑا حصہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے آثار واقوال میں موجود ہے (اس لیے ایک مجتہد بڑی کامیابی کے ساتھ اس ذخیرۂ روایات سے مسائل کا جواب معلوم کر سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ قوت اجتہاد بہم پہنچنے کے لیے صرف روایات کا اندوختہ ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک ادیب کی سی نظر اور ایک محدث کا سا فہم بھی ضروری ہے)۔ سو یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک سوجھ بوجھ رکھنے والا عالمِ زبان، مواقع کلام کی، اور ایک عالمِ روایات، اصول تطبیق روایات اور ترتیب دلائل وغیرہ امور کی معرفت سے کبھی بیگانہ نہیں ہوا کرتا۔ اس استعداد اجتہاد کی زندہ مثال امام احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ ہیں۔ کبھی یہ استعداد تخریج کے طریقوں کو پوری طرح ذہن میں جما لینے اور ان اصولی قواعد وضوابط کو دماغ میں محفوظ کر لینے سے پیدا ہوتی ہے جو ہر باب کے متعلق ائمہ فقہ سے منقول ہیں۔ بشرطیکہ اس کے ساتھ ہی احادیث اور آثار کا ایک معقول ذخیرہ بھی انسان کے پاس موجود ہو۔ اس نوعِ استعداد کی کامل مثال تم کو امام ابو یوسف اور امام محمد بن حسن کی ذاتہائے گرامی میں ملے گی۔

دوسرا گروہ ان علما کا تھا جو قرآن وسنت پر اتنی نظر تو رکھتے تھے جس سے فقہ کے اصول ومبادی اور اس کے بنیادی مسائل کو ان کے تفصیلی دلائل کے ساتھ معلوم کر سکیں لیکن (جو جزئی مسائل ان کے سامنے آتے تھے) ان کے ایک حصہ پر اگر وہ خود دلائل کی روشنی میں رائے قائم کر لیتے تھے تو باقی دوسرے حصہ

میں توقف اختیار کرنے پر مجبور ہو کر علماء کے مشورے کے محتاج بھی ہوتے تھے، کیونکہ وہ اپنے اندر اجتہاد کامل کی پوری شرائط نہیں رکھتے تھے جس طرح کہ ایک مجتہد مطلق رکھتا ہے۔ پس اس قسم کے علما بعض مسائل کے لحاظ سے مجتہد اور بعض کے لحاظ سے غیر مجتہد تھے۔ صحابہؓ اور تابعینؒ کے متعلق یہ چیز تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ جب ان کو کوئی حدیث پہنچتی تو وہ بغیر کسی شرط اور قید کے اس پر عمل کرنا شروع کر دیتے۔

شخصی تقلید کا آغاز تیسری صدی ہجری تقلید شخصی کا پیام لے کر آئی اور لوگوں کے اندر کسی ایک ہی متعین مجتہد کے مذہب کی پابندی نے اپنے ظہور کا اعلان کیا۔ اب ایسے لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے جو تقلید شخصی کے دائرہ سے باہر ہوں۔ اس وقت یہ چیز وجوب کا مرتبہ حاصل کر چکی تھی جس کا ایک خاص سبب تھا جس کی تفصیل یہ ہے کہ فقہ کے کسی طالب علم کو دو ہی صورتیں پیش آ سکتی ہیں:

(۱) یا تو اس کی تمام تر توجہ ان مسائل کی واقفیت بہم پہنچانے، ان پر نقد کرنے، ان کے مآخذ کی تحقیق کرنے اور ان میں باہم ترجیح دینے پر مرتکز ہو جن کا جواب ائمہ مجتہدین تفصیلی دلائل کے ساتھ پہلے دے چکے ہوں۔ یہ ایک ایسا بھاری اہمیت کا کام ہے جو اس وقت تک کامیابی کے ساتھ سرانجام نہیں پا سکتا جب تک کہ اس شخص کو کسی ایسے امام مجتہد کی رہنمائی میسر نہ ہو جس نے فقہ کے ایک ایک باب میں مسائل کو پھیلا کر بیان کرنے اور ان کے دلائل کو مہیا کرنے کی زحمتوں سے اس کو بے نیاز کر دیا ہو، تاکہ وہ امام کی ان تصریحات سے مدد لے کر نقد و تحقیق اور بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دینے کی مہم میں (یکسو ہو کر) مشغول ہو سکے۔ ورنہ اگر بالفرض کسی امام کی اقتدا اسے میسر نہ ہو تو ایک کامیاب فقیہ بننا اس کے لیے دشوار ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ سہل راہ ہوتے ہوئے دشوار گذار راہ اختیار کرنا کھلی ہوئی لغویت ہے۔

یہ ایک امر واقعی ہے کہ علم فقہ کا یہ طالب (جس امام کی پیروی میں داد تحقیق دے رہا ہے) اس کے بعض اقوال کو پسندیدہ سمجھ کر ان سے اتفاق کرے گا تو بعض سے اختلاف بھی کرے گا۔ (اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے اتفاق اور اختلاف کا تناسب کیا ہے) اگر اختلاف اتفاق سے کم ہے تو ایسی صورت میں یہ فقیہ اسی امام مجتہد کے مذہب کے اندر "اصحاب وجوہ"[۱۵] میں سے شمار کیا جائے گا، اور اگر صورت حالات

اس کے برعکس ہو تو اس وقت (وہ اصحاب وجوہ میں سے شمار کیا جائے گا یعنی) اس کی انفرادی رائیں مذہب مذکور کا ایک جزو قرار پائیں گی۔ لیکن اس کے باوجود وہ فقیہ فی الجملہ اسی امام مذہب ہی کی طرف منسوب رہے گا اور (اسی نسبت کے ذریعہ) ان لوگوں سے متمیز رہے گا جو کسی اور امام کی، اس کے مذہب کے اکثر اصول و فروع میں، اقتدا کر رہے ہوں[1]۔

اس قسم کے صاحب علم کے بعض اجتہادی مسائل لازماً ایسے پائے ہی جائیں گے جن کے جواب سے اب تک کی فقہی تصنیفات بالکل خاموش ہوں گی، کیونکہ انسانی زندگی میں نت نئے واقعات پیش آتے ہی رہتے ہیں اور اجتہاد کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے (اس لیے بعض مسائل میں اس صاحب علم کا اپنے نجی اجتہاد سے کام لینا ایک امر ناگزیر ہے) سو وہ ان مسائل کا جواب اپنے امام مجتہد کی دستگیری کا خیال ترک کرکے، براہ راست کتاب و سنت اور اقوال سلف سے معلوم و مستنبط کرتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس قسم کے (اچھوتے) مسائل کی تعداد ان مسائل کے مقابلہ میں بہت کم ہوتی ہے جن کا (کوئی نہ کوئی) جواب پہلے کے علماء و ائمہ دے چکے ہیں ـــ ایسے شخص کو "مجتہد مطلق منتسب" کہا جاتا ہے۔

(۳) یا پھر اس کی ساری توجہات کا مرکز ان مسائل پر دسترس حاصل کرنا ہو جن کو فتویٰ پوچھنے والے اس سے دریافت کریں اور جن کے متعلق علمائے سلف کا کوئی جواب منقول نہ ہو۔ ایسا عالم فقہ ایک ایسے امام کی اقتدا کا، مذکورہ بالا عالم فقہ سے بھی زیادہ، محتاج ہے جس کی، فقہ کے ایک ایک باب کے مرتب شدہ اصولوں میں رہبری سے وہ فائدہ حاصل کر سکے۔ کیونکہ فقہ کے مسائل باہم گتھے ہوئے ہیں اور ان کی فروع

(حاشیہ صفحہ سابق) [1] "اصحاب وجوہ" سے مراد وہ علماء ہیں جو ہوں تو کسی امام مجتہد کے مقلد، اور اسی کے اصول و اقوال سامنے رکھ کر مسائل کی تخریج کرتے ہوں مگر بعض جزئی مسائل میں کچھ اپنے مخصوص دلائل کی بنا پر اپنے امام کی رائے سے اختلاف بھی کر جاتے ہوں۔ اس قسم کی یہ اختلافی رائیں بھی اسی امام کے مذہب کا ایک جز سمجھی جاتی ہیں۔ (مترجم)

(حاشیہ صفحہ ہذا [1]) مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک عالم کسی ایک امام مجتہد کی اقتدا میں یہ روش اختیار کر سکتا ہے کہ اس کے اکثر و بیشتر اصولوں کو ماننے کے باوجود بے شمار مسائل میں اس سے اختلاف کرے، اسی طرح دوسرے ائمہ کی اقتدا میں دوسرے علما بھی یہی روش اختیار کر سکتے ہیں، تو اگرچہ اس قسم کے علما کو ان ائمہ کا مقلد نہیں کہنا چاہیے مگر اس کے باوجود ہر عالم اپنے امام کی طرف اس وجہ سے منسوب کر دیا جاتا ہے تاکہ یہ انتساب اسی قسم کے دوسرے علما کے مقابلہ میں باعث امتیاز بن سکے۔ (مترجم)

وجزئیات ان کے اصول سے گہری وابستگی رکھتی ہیں، تو اگر یہ عالم (بطور خود) تمام مذاہب فقہ کی جانچ پڑتال اور تمام مجتہدین کے اقوال کی چھان بین از سر نو شروع کرے تو اپنے کو ایک ایسی گھاٹی میں لا ڈالے جس کو طے کرنے کی اس کے قدموں میں سکت نہیں اور جس سے غالباً وہ ساری عمر چل کر بھی باہر نہ نکل سکے۔ پس اپنے مقصد کے حصول کی خاطر اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ جن مسائل کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے ان پر غور و فکر کی نگاہ ڈالے (اور ان کو سامنے رکھتے ہوئے مزید جزئیات کی) تفریع میں ہمہ تن مشغول ہو جائے۔ (لیکن یہ سمجھنا چاہیے کہ ایسا فقیہ کبھی بھی اپنے امام مجتہد سے اختلاف نہیں کرتا، نہیں، بلکہ) بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ کتاب و سنت اور اقوال سلف اور اپنے ذاتی قیاس کی بنا پر اپنے امام کے خلاف رائے قائم کرتا ہے، لیکن یہ اختلاف موافقت کے مقابلہ میں بہت کم ہوتا ہے ــــ ایسا عالم "مجتہد فی المذہب" کہلاتا ہے۔

یہی دو صورتیں ہیں کہ اُس وقت ایک طالب علمِ فقہ کو عملاً انھی دو میں سے ایک سے واسطہ پڑ سکتا تھا (رہ گئی تیسری صورت، یعنی یہ کہ وہ پہلے تو اپنی ساری کوشش ان مسائل کی دلیلیں معلوم کرنے میں صرف کر ڈالتا جن کا جواب پہلے کے علما دے چکے ہیں، پھر کہیں جا کر ان میں سے اپنے پسندیدہ اور مختار مسائل کو سامنے رکھ کر مزید مسائل کی تفریع میں منہمک ہوتا، تو یہ صورت عملاً ایک ناممکن اور غیر واقعی صورت ہے، کیونکہ نزول وحی کا بابرکت زمانہ گزرے ہوئے ایک مدت بیت چکی تھی، جس کے باعث ہر عالم کے لیے ان امور میں ــ، جن پر علم اور عالمیت کا دار و مدار ہے، اکثر کے اندر علمائے سلف کا دست نگر ہونا ضروری ہو گیا۔ مثلاً کون حدیث کتنے طریقوں سے، اور کن مختلف عبارتوں میں مروی ہی ہے؟ کون راوی کس پایہ کا ہے؟ کون حدیث کس مرتبہ میں صحیح یا ضعیف ہے؟ مختلف احادیث و آثار میں مطابقت کیونکر پیدا کی جائے؟ کون سی احادیث فقہ کا ماخذ ہیں؟ اسی طرح مشکل اور غریب الفاظ کے معنی کی تحقیق کرنا۔ فقہ کے اصولوں کا علم حاصل کرنا اور ان تمام بے شمار مسائل کو پوری شرح و بسط اور توضیحِ اختلاف باہمی کے ساتھ بیان کرنا جن میں علمائے سلف کلام کر چکے ہیں، پھر ان مختلف روایات (اور مسائل) کے اندر راجح اور مرجوح کا فیصلہ کرنے اور ان کو دلائل پر پرکھنے میں اپنے قوائے فکر و تحقیق کو لگا دینا وغیرہ

(بے شمار کام ایسے تھے جن میں متقدمین کے افکار و تحقیقات پر اعتماد اور ان سے استفادہ کیے بغیر ان کے لیے کوئی چارہ کار ہی نہ تھا) اور اگر وہ بطور خود ان کاموں میں اپنی زندگی کے لمحات ختم کر ڈالتا تو پھر (مزید مسائل ضروریہ کی) تفریع کا حق کیونکر پورا ہو سکتا؟ جبکہ انسانی دماغ کے متعلق یہ ایک ناقابلِ انکار مسلمہ ہے کہ خواہ وہ کتنا ہی ذکی کیوں نہ ہو مگر اس کی ایک متعین حد ہے جس کے آگے وہ پرواز نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ کمالِ فکر و نظر ان علما کو ضرور حاصل ہو سکا تھا جو باعتبار زمانہ بزم اجتہاد کی صف اول میں تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ وحی کا زمانہ گذرے ہوئے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی علوم کی یہ گوناگونی تھی۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ کمال چند نفوس سے زیادہ کو حاصل نہ ہو سکا، اور وہ چند نفوس بھی اپنے تمام اوصافِ کمالیہ کے باوصف (دوسرے علما و مشائخ کی علمی رہنمائی اور اعانت سے یکسر بے نیاز نہ تھے بلکہ) اپنے مشائخ ہی کی پیروی اختیار کیے ہوئے تھے اور انہی کے سہارے راہ اجتہاد میں قدم اٹھاتے تھے لیکن چونکہ اس علم میں انھوں نے کافی تصرفات کیے (اور اپنی ذاتی تحقیقات کا ایک بڑا ذخیرہ پیدا کر گئے) اس لیے وہ مستقل امام اور مجتہد ہو گئے۔

وجوب تقلید پر عام امت کا اجماع مختصر یہ کہ ائمہ مجتہدین کے مذاہب کو اختیار کر لینا ایک قدرتی راز تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے (بعض حکمتوں اور مصلحتوں کے پیش نظر) علما کے دلوں میں ڈالا اور انھیں اس پر متفق کر دیا، خواہ (اس اتفاق کے لیے اقدام، اور اس کے مصالح کا) علم و احساس انھیں ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ ہمارے اس خیال کی تائید (دیگر اقوال علما کے علاوہ) مشہور شافعی فقیہ ابن زیاد یمنی کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے جن کو انھوں نے ایسے دو مسئلوں کے متعلق استفسار کے جواب میں ارشاد فرمایا ہے جن کے اندر امام بلقینی نے امام شافعی کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔ یہ الفاظ فتاویٰ ابن زیاد میں اس طرح تحریر ہیں:-

"تم بلقینی کے کلام کی توجیہ نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ تمھیں یہ نہ معلوم ہو کہ ان کا علمی مقام کیا تھا۔ سو (پہلے یہ جان لو کہ) وہ "امام مجتہد مطلق منتسب، غیر مستقل، صاحب تخریج و ترجیح" ہیں۔ "مجتہد مطلق منتسب" میں اس شخص کو کہتا ہوں جو اپنے اُس امام کے مذہب میں، جس کی طرف وہ منسوب ہے،

ترجیح کا اختیار رکھتا ہو اور قول راجح کی مخالفت بھی کر سکتا ہو۔ اکابر علمائے شافعیہ میں سے — متقدمین میں سے بھی اور متاخرین میں سے بھی — اکثر کا یہی حال ہے، جن کا تذکرہ اور جن کے درجات کی ترتیب کا بیان آگے آتا ہے۔ اچھا تو بلقینی کو جن ارباب نظر نے "مجتہدین مطلق منتسب" کے زمرہ میں شامل کیا ہے۔ ان میں سے ایک ان کے شاگرد ولی ابوزرعہ بھی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے اپنے استاذ امام بلقینی سے پوچھا "آخر یہ کیا بات ہے کہ شیخ تقی الدین سبکی اجتہاد سے کتراتے ہیں، حالانکہ ان کے اندر اجتہاد کی تمام شرائط موجود ہیں؟ وہ تقلید کیوں کرتے ہیں؟" ابوزرعہ نے اس کے بعد فرمایا کہ "میں نے شرم کی وجہ سے خود ان کا نام نہ لیا (حالانکہ یہی سوال خود ان کے متعلق بھی پیدا ہو رہا تھا) جس کی وجہ میرا یہ خیال اور یہ علم تھا کہ (اس طرح دوسروں کے نام پر) میں اس امر کے حقیقی وجوہ دستیاب کر سکوں گا، لیکن امام بلقینی یہ سوال سن کر خاموش ہو رہے تو میں خود ہی بولا کہ "میرے نزدیک تو اس کی وجہ صرف وہ سرکاری ملازمتیں ہیں جو (حکومت کی طرف سے) چاروں مذاہب فقہی کے علما کے لیے (مخصوص اور) مقرر ہیں اور یہ کہ اگر کوئی شخص ان مذاہب کی تقلید سے آزاد ہو کر بطور خود اجتہاد کرنے لگے تو پھر وہ اس حق سے محروم ہو جائے گا، قضا کے عہدے اسے نہ مل سکیں گے، لوگ اس سے استفتا کرنا چھوڑ دیں گے اور وہ بدعتی مشہور ہو جائے گا۔"
میری یہ بات سن کر امام بلقینی مسکرا اٹھے اور اس سے اتفاق کا اظہار کیا۔"

لیکن میرے (یعنی ابن زیاد یمنی کے) لیے ایسا سمجھنا دشوار ہے کہ ان لوگوں نے اجتہاد سے اس (ذلیل) مصلحت کی بنا پر اجتناب کیا جس کی طرف ابوزرعہ نے اشارہ کیا ہے۔ ان بزرگوں کا مقام اس سے کہیں بلند ہے کہ وہ اجتہاد کی مکمل صلاحیتیں رکھنے کے باوجود عہدۂ قضا اور ذرائع معاش کی خاطر اجتہاد سے رکے رہتے۔ ان بزرگوں کے متعلق ایسا سوء ظن کسی طرح بھی مناسب نہیں کیونکہ، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا، جمہور کا مختار اور راجح مذہب یہ ہے کہ ایسا مرتبۂ علمی رکھنے والے کے لیے اجتہاد کرنا واجب ہے (اس لیے یہ کس طرح باور کیا جائے کہ ملازمت اور مشاہرہ کے لالچ میں آکر انہوں نے ایک امر واجب کو زندگی بھر ترک کیے رکھا؟ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ) ابوزرعہ کہتے ہیں

یہ کس طرح مناسب تھا کہ ان لوگوں کے بارے میں اتنی بھاری بات منہ سے نکالیں اور اس پر امام بلقینی کو اپنا موافق بھی ظاہر کریں؟ حالانکہ علامہ جلال الدین سیوطی کتاب "التنبیہ" کی شرح کے اندر، باب الطلاق میں، ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ "ائمہ کے خود اپنے اقوال میں جو اختلافات واقع ہوئے ہیں[۱] ان کی وجہ ان کے اجتہاد کا تغیر ہے، کسی موقع پر وہ جس چیز کو صحیح قرار دیتے ہیں وہ وہی چیز ہوتی ہے جو اُن کے اجتہاد کی نظر میں اُس وقت صحیح معلوم ہوتی ہے[۲]۔ اور اس کتاب کا مصنف وہ شخص ہے جس کے رتبۂ اجتہاد کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ کتنے ہی علما نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ مصنف مذکور، ابن الصباغ، امام الحرمین اور امام غزالی اجتہاد مطلق کے مقام پر فائز تھے۔ اور یہ جو فتاوی ابن صلاح میں مرقوم ہے کہ یہ لوگ اجتہاد فی المذہب کا مرتبہ رکھتے تھے نہ کہ اجتہاد مطلق کا، تو اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ یہ لوگ اجتہاد مطلق مستقل کا درجہ نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا مقام اجتہاد مطلق منتسب کا تھا، کیونکہ "اجتہاد مطلق" کی دو قسمیں ہیں، ایک تو مطلق مستقل، دوسرا مطلق منتسب، جیسا کہ خود ابن صلاح نے اپنی کتاب آداب الفتیا میں، اور امام نووی نے شرح "المہذب میں" اس کی تصریح کی ہے۔ ان میں سے پہلی قسم کا دروازہ تو چوتھی صدی ہجری کے اوائل ہی میں ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا جس کے کھلنے کا اب کوئی امکان نہیں۔ باقی رہی دوسری قسم تو وہ اب بھی باقی ہے اور آثار قیامت نمودار ہونے تک باقی رہے گی، (کسی زمانہ میں بھی) اس کا موقوف ہو جانا شرعاً جائز نہیں، کیونکہ وہ فرض کفایہ ہے۔ یعنی اگر کسی زمانہ کے مسلمان ایسا اجتہاد کرنے سے ہچکچانے لگیں یہاں تک کہ اسے یکلخت چھوڑ بیٹھیں تو سب کے سب گنہگار ہوں گے، جیسا کہ ہمارے علماء نے، مثلاً

[۱] یعنی ایک ہی امام نے ایک ہی مسئلے میں کبھی ایک فتوی دیا ہے اور کبھی اپنی پہلی رائے کے خلاف دوسرا فتوی دیا ہے۔ مثلاً امام شافعی کے اقوال میں یہ بات اکثر ملتی ہے کہ یہ ان کا پہلا قول ہے اور یہ دوسرا قول۔

[۲] مطلب یہ ہے کہ ان ائمہ کے احساس ذمہ داری کا تو یہ حال تھا کہ جس وقت ان کا اجتہاد کسی مسئلے میں ایک بات کو حق پاتا تھا وہ بے تکلف اس کا اظہار کر دیتے تھے اور اس کی بھی پروا نہ کرتے تھے کہ ہم خود پہلے دوسری رائے ظاہر کر چکے ہیں۔

امام ماوردی نے اپنی کتاب "الحاوی" میں، رویانی نے "البحر" میں، بغوی نے "التہذیب" میں اور اسی طرح کے اور بہت سے اکابر علما نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے۔ یاد رہے کہ یہ فرض کفایہ، اجتہاد مقید (یعنی اجتہاد فی المذہب) سے ادا نہیں ہو سکتا، جیسا کہ ابن صلاح اور امام نووی کی تصریحات بتلاتی ہیں۔ ہم نے بھی اپنی کتاب "الرد علی من اخلد الی الارض وجہل ان الاجتہاد فی کل عصر فرض" میں اس مسئلہ پر مفصل اور سیر حاصل بحث کی ہے۔

یہ ارباب علم (جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں) محض اس وجہ سے کہ وہ اجتہاد مطلق منتسب کا درجہ رکھتے تھے، دائرۂ شافعیت سے باہر نہ شمار کیے جائیں گے۔ جیسا کہ امام نووی نے اور "طبقات" میں ابن صلاح نے واضح لفظوں میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے اور ابن سبکی نے بھی ان کی ہمنوائی کی ہے۔ چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ ان حضرات نے مذہب شافعی کی کتابیں تصنیف کیں (اور ان کی فقہی تصنیفات فقہ شافعی کی کتابیں کہی اور مانی جاتی ہیں۔ پھر بحیثیت ایک شافعی فقیہ کے) فتوے دیے، اور شافعی مناصب پر مقرر کیے گئے، مثلاً اس کتاب کے مصنف اور ابن الصباغ کو بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں تدریس کی خدمت سپرد کی گئی، اور امام الحرمین اور امام غزالی کو نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ میں اور ابن عبدالسلام کو قاہرہ کے مدرسہ جابیہ اور مدرسہ ظاہریہ میں تعلیم کا انچارج بنایا گیا، اور ابن دقیق العید کو مدرسہ صلاحیہ میں، جو ہمارے امام (امام شافعی) کے مقبرہ سے لگا ہوا ہے، نیز مدرسۂ فاضلیہ اور مدرسۂ کاملیہ میں فرائض تعلیم حوالے کیے گئے۔ ہاں جو شخص اس مقام سے بھی اونچا ہو کر اجتہاد مطلق مستقل کے مقام بلند پر جا پہنچا ہو وہ البتہ حلقۂ شافعیت میں شامل نہیں کہا جا سکتا، نہ اس کے اقوال فقہ شافعی کی کتابوں میں درج کیے جا سکتے۔ لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، اصحاب شافعی میں سے سوائے ابوجعفر ابن جریر طبری کے کوئی شخص بھی اس مقام تک نہیں پہنچا۔ ابن جریر البتہ پہلے شافعی تھے، پھر ایک مستقل مذہب فقہی کے امام مجتہد ہو گئے۔ اسی وجہ سے علامہ رافعی وغیرہ نے فرمایا ہے کہ ابن جریر کا تفرد مذہب شافعی کے وجوہ میں سے کوئی وجہ نہیں شمار ہوتا[1]۔

[1] "تفرد" کا مطلب ہے کسی مسئلہ میں تمام علمائے فقہ شافعی کے خلاف رائے قائم کرنا۔ اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سیوطی نے مذکورہ بالا الفاظ میں جو بات کہی ہے وہ میرے نزدیک ابو زرعہ کے خیال سے زیادہ اچھی ہے (اور اسی کو میں حقیقت کی ترجمانی سمجھتا ہوں) لیکن ان کے الفاظ سے جو بات نکلتی ہے کہ ابن جریر طبری کو شافعی نہ شمار کرنا چاہیے، وہ قابل قبول نہیں. کیونکہ یہی علامہ رافعی (جن کی رائے کا سیوطی نے حوالہ دیا ہے) کتاب الزکوٰۃ کے آغاز میں لکھتے ہیں کہ "ابن جریر طبری کا تفرد مذہب شافعی کے وجوہ میں سے کوئی وجہ نہیں شمار ہوتا۔ اگرچہ وہ خود اصحاب شافعی کے طبقات میں شمار ہوتے ہیں"۔ اسی طرح امام نووی اپنی تصنیف "التہذیب" میں لکھتے ہیں کہ "ابو عاصم عبادی نے ابن جریر کا تذکرہ فقہائے شافعیہ کے سلسلہ میں کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ ہمارے صف اول کے علماء میں سے ہیں۔ انھوں نے فقہ شافعی علامہ ربیع مرادی اور حسن زعفرانی سے حاصل کی تھی۔" (پس وہ بہرحال ایک شافعی عالم تھے) اور ان کے شافعیت کی طرف منسوب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا طریقۂ اجتہاد اور ان کا اسلوب استقراء و ترتیب دلائل قریب قریب بالکل وہی تھا جو امام شافعیؒ کا تھا، اور ان کے مجتہدات بالعموم امام موصوف کے مجتہدات سے ہم آہنگ تھے۔ اور اگر کبھی مخالف پڑے بھی تو ایسے ہی کہ وہ کوئی خاص اہمیت حاصل نہ کر سکے۔ مختصر یہ کہ ایسے مسائل بہت کم ہیں جن میں انھوں نے امام شافعی سے الگ کوئی راہ اختیار کی ہو۔ اور ظاہر ہے کہ) یہ چیز ان کے دائرۂ شافعیت میں داخل سمجھے جانے کے خلاف کوئی حجت نہیں بن سکتی۔

امام محمد بن اسمٰعیل بخاری کا موقف فقہی بھی یہی نوعیت رکھتا ہے اور ان کا شمار بھی طبقات شافعیہ میں ہے۔ اُن لوگوں میں سے جنھوں نے امام بخاری کو طبقات شافعیہ میں شامل کیا ہے، ایک علامہ تاج الدین سبکی بھی ہیں جو فرماتے ہیں کہ "امام بخاری نے فقہ حُمیدی سے سیکھی اور حُمیدی نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) جس طرح امام غزالی، علامہ ابن عبدالسلام اور امام الحرمین وغیرہ علمائے شافعی کے منفرد اقوال (جن میں وہ تنہا ہوتے ہیں اور دوسرے تمام علمائے شافعی بلکہ خود امام شافعی کی رائے بھی ان کے خلاف ہوتی ہے) اپنے تفرد کے باوجود مذہب شافعی ہی کے اقوال مانے جاتے ہیں اور ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "مذہب شافعی میں ایک قول یہ بھی ہے"۔ اس طرح ابن جریر طبری کے اختلافی اقوال کو (جن میں وہ تنہا ہوتے ہیں) مذہب شافعی کے اقوال نہیں مانا جاتا اور ان کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ اس مسئلہ میں مذہب شافعی کے اندر ایک قول یہ بھی ہے۔

امام شافعیؒ سے"۔ ہمارے استاذ علام نے بھی امام بخاری کے حلقہ بگوش شافعیت ہونے پر یہی دلیل دی ہے کہ تاج الدین سبکی نے ان کا تذکرہ طبقات شافعیہ میں کیا ہے۔ نوویؒ کی جو عبارت ہم نے اوپر نقل کی ہے اس سے اس (طرز استدلال کی صحت) کی پوری تائید بھی ہوتی ہے۔ شیخ تاج الدین سبکی اپنی کتاب "طبقات" میں فرماتے ہیں:

"کسی ایسے تخریجی مسئلہ کے سلسلہ میں، جس کی تخریج بالکل اچھوتی ہو، دیکھنا چاہیے کہ تخریج کرنے والا کن لوگوں میں سے ہے؟ اگر وہ ان لوگوں میں سے ہے جن پر عموماً شافعیت اور تقلید غالب رہتی ہے، مثلاً شیخ ابوحامد غزالی اور قفّال، تو اس کا شمار شوافع میں ہوگا، اور اگر اس کے برعکس وہ ان لوگوں میں سے ہے جو اکثر حدود شافعیت سے باہر نکل جایا کرتے ہیں، مثلاً محمد بن جریر، محمد بن خزیمہ، محمد بن مروزی اور محمد بن منذر، تو وہ پیروان شافعیت میں نہ گنا جائے گا۔ رہا مزنی اور ان کے بعد ابن سریج کا معاملہ تو ان کے بارے میں تحقیق یہ ہے کہ ان کا مقام بین بین سا ہے، نہ تو وہ مذکورہ بالا چاروں حضرات کی طرح عموماً مذہب شافعی سے باہر ہی رہتے ہیں اور نہ عراقیوں اور خراسانیوں کی طرح حدود شافعیت کی پابندی کرتے ہیں۔"

نیز یہی علامہ سبکی اپنی "طبقات" میں شیخ ابوالحسن اشعری امام اہل السنت والجماعت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "وہ شافعی کہے جاتے ہیں، کیونکہ فقہ انھوں نے شیخ ابواسحاق مروزی ہی سے حاصل کی تھی۔"

ہمارے اس نقطۂ نظر کی تائید و شہادت "کتاب الانوار" کے صفحات میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ اس کا مصنف کہتا ہے:

"جو لوگ شافعیت یا حنفیت یا مالکیت یا حنبلیت کی طرف منسوب ہیں (اور ائمہ اربعہ کے پیرو کہے جاتے ہیں) ان کے چند طبقے ہیں:۔

(۱) ایک تو طبقۂ عوام ہے جس کا (اپنے امام مثلاً) امام شافعی کی تقلید کرنا (براہ راست نہیں ہوتا بلکہ) ان مجتہدوں کے توسط سے ہوتا ہے جو امام مذکور کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔

(۲) دوسرے وہ لوگ ہیں جو مرتبۂ اجتہاد کو پہنچے ہوئے ہیں۔ اگرچہ ایسا شخص جو خود مجتہد ہو کسی دوسرے مجتہد کی تقلید نہیں کرتا، مگر اس کے باوجود یہ لوگ ایک امام کی طرف اس بنا پر منسوب کر دیے جاتے ہیں کہ وہ طریق اجتہاد اور انداز استدلال اور اسلوب ترتیب دلائل وہی اختیار کرتے ہیں جو اس امام مجتہد مطلق کا ہوتا ہے۔

(۳) تیسرا طبقہ متوسطین کا ہے یعنی وہ لوگ جن کو اگرچہ اجتہاد کا مقام حاصل نہیں ہو سکا مگر وہ اصول اجتہاد ان کے سامنے روشن ہوتے ہیں جن کو امام نے اختیار کیا تھا اور اس امر کی پوری قدرت رکھتے ہیں کہ جو مسئلہ (اقوال امام میں) تصریح کے ساتھ موجود نہیں، اس کو امام کے مصرح اقوال پر قیاس کر کے جواب دے سکیں۔ یہ لوگ بھی بہرحال امام کے مقلد (ہی) ہوتے ہیں، اور انہی کے ساتھ وہ عوام بھی جو ان کے اقوال کو اختیار کریں۔ (اب رہا یہ سوال کہ عوام ان کے قیاس کردہ اقوال پر عمل کرتے ہیں اس لیے ان کو بھی امام و مقتدی کہا جائے یا نہ کہا جائے تو اس کے بارے میں) مشہور یہ ہے کہ ان کو یہ حیثیت حاصل نہیں، کیونکہ وہ تو خود ہی دوسرے کے مقلد ہیں۔"

ایک اعتراض اور اس کا جواب

(ان دلائل و شواہد کی روشنی میں اگر تم کسی متعین مذہب فقہی سے انتساب کے مفہوم اور حدود تقلید کی وسعت پر غور کرو گے تو تمھیں محسوس ہو جائے گا کہ دوسری ہی صدی ہجری کے بعد تقلیدی رجحانات کے ہمہ گیر اور تقلید کے واجب ہو جانے کے متعلق ہمارا بیان واقعیت کی سچی ترجمانی ہے) اور اگر تم یہ اعتراض کرو کہ "جب شریعت ایک ہی ہے تو جو چیز ایک وقت میں واجب نہ تھی وہ کسی دوسرے وقت میں بھی واجب نہیں ہو سکتی، اس لیے تمھارا یہ کہنا کہ "مجتہد مستقل کی پیروی پہلے واجب نہ تھی، پھر واجب ہو گئی" ایک ایسی بات ہے (جو اپنی تغلیط آپ کر رہی ہے کیونکہ اس کے اندر کھلا ہوا تناقض اور منافات موجود ہے"۔ تو اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اصل میں جو چیز واجب ہے وہ تو یہ ہے کہ امت کے اندر ایسا شخص یا اشخاص ضرور موجود رہنے چاہئیں جو فروعی احکام پر ان کے تفصیلی دلائل کے ساتھ عبور رکھتے ہوں، اس وجوب پر تمام اہل حق کا اجماع ہے۔ (پھر یہ

اصول بھی بالکل مسلّم اور بدیہی ہے کہ) جس چیز پر کسی امر واجب کے حصول کا دار و مدار ہوتا ہے وہ خود بھی واجب ہوتی ہے۔ اور اگر کسی امر واجب کے حصول کے کئی ایک طریقے ہوں تو ان میں سے کسی ایک طریقہ کا حاصل کرنا واجب ہوگا (کسی متعین طریقہ کی خصوصیت نہ ہوگی)۔ لیکن اگر طریقہ ایک ہی ہو تو بالخاص اسی طریقہ کا حصول واجب ہوگا۔ مثلاً اگر ایک شخص بھوک کی شدت سے جاں بلب ہو اور اس بھوک کے دور کرنے کے متعدد ذرائع اس کے بس میں ہوں۔ جیسے کھانا خرید سکتا ہو جنگل سے میوے چن سکتا ہو، اور کھانے کے قابل جانوروں کا شکار کرسکتا ہو، تو ان تینوں ذرائع میں سے بلاتعین کسی ایک کو اختیار کرنا واجب ہے۔ لیکن اگر وہ شخص ایسے مقام پر ہو جہاں نہ تو کوئی شکار مل سکتا ہو نہ ہی میوے دستیاب ہوسکتے ہوں (اور بھوک دور کرنے کا ایک ہی چارۂ کار ہو) تو اس کے لیے واجب یہی ہے کہ پیسے خرچ کر کے کھانا خریدے (اسی مثال پر مسئلہ زیر بحث کو بھی قیاس کرلو)۔ اس واجب اصلی کے حاصل کرنے کے لیے، جس کا ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا ہے، سلف کے پاس چند راستے تھے، سو ان کے لیے واجب یہ تھا کہ ان راستوں میں سے کسی ایک راستہ کو اختیار کرلیں، کسی خاص راستہ کی تعیین نہ تھی۔ پھر (کچھ قدرتی اسباب کے ماتحت) یہ تمام راستے ماسوا ایک کے بند ہوگئے۔ اندریں حالات سب کے لیے خاص اسی ایک راستہ کا اختیار کرنا ضروری ہوگیا۔ مثال کے طور پر دیکھو کہ سلف حدیثیں لکھا نہیں کرتے تھے۔ لیکن اب، ہمارے زمانہ میں حدیثوں کی کتابت واجب ہوچکی ہے کیونکہ (زبانی نقل و بیان کا دستور اور سلسلہ مدت ہوئی ختم ہوچکا ہے اور) آج روایتِ احادیث کا اس کے سوا کوئی ممکن طریقہ باقی ہی نہیں رہ گیا ہے کہ ان کی کتابوں کو سامنے رکھا جائے۔ یہی حال علوم نحو و لغت کا ہے، کہ یہ علوم بھی ایک لمحہ کے لیے سلف کی توجہ کو جذب نہ کرسکے، کیونکہ عربی ان کی اپنی زبان تھی، ان علوم (میں سر کھپانے) کی ان کو حاجت ہی کیا تھی، لیکن اب، اس زمانہ میں زبان عربی سے باقاعدہ واقفیت بہم پہنچانا واجب ہوچکا ہے، اس لیے کہ یہ زمانہ ابتدائی اہل عرب کے زمانے سے (جو عربی زبان کے ماہر اور نکتہ شناس تھے) کافی دور ہوچکا ہے۔ اسی طرح اس اصول کی بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

تقلید امام معیّن کب واجب ہے

پس اسی اصول پر تقلید امام معین کے وجوب کو بھی قیاس کرنا چاہیے، کہ اس کا بھی یہی حال ہے یعنی کبھی وہ واجب ہوتی ہے اور کبھی نہیں (مثال کے طور پر فرض کرلو کہ) اگر ہندوستان

یا ماوراء النہر کے کسی خطہ میں ایک جاہل مسلمان رہ رہا ہے اور اس کے قرب وجوار میں کوئی شافعی یا مالکی یا حنبلی عالم دین موجود نہیں، نہ ہی ان تینوں مذاہب کی کوئی کتاب موجود ہے، تو ایسے شخص کے لیے ضروری ہے کہ مذہب ابوحنیفہ کی تقلید کرے اور حرام ہے کہ دائرہ حنفیت سے قدم باہر نکالے، کیونکہ اگر اس نے ایسا کیا تو (دائرہ حنفیت کے ساتھ ہی) دائرۂ اسلام سے بھی باہر جا پڑے گا اور اس کے دین وایمان کا کوئی وزن باقی نہ جائے گا۔ بخلاف اس کے اگر ایسا شخص حرمین میں ہو تو مخصوص طور پر کسی ایک ہی امام کی تقلید واجب نہ ہوگی کیونکہ وہاں اس کے لیے ہر مذہب فقہی سے رہنمائی حاصل کرنا ہمہ دم ممکن ہے۔ (پہلی صورت میں ایک ہی امام معین کی تقلید کے واجب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی دوسرے مذہب فقہی کا کوئی عالم موجود ہی نہیں تو وہ فتوے کس سے پوچھے گا؟ رہ گیا یہ امر کہ ظن وتخمین سے کام لے کر کسی دوسرے مذہب کی پیروی کرے، تو کسی مذہب کے احکام پر عمل کرنے اور اس کا حق تقلید ادا کرنے کے لیے) ظن وتخمین کفایت نہیں کرسکتا، اس کے لیے یقینی واقفیت ضروری ہے۔ اسی طرح اس کے لیے یہ بھی کافی نہیں کہ عوام کی سنی سنائی باتوں (کو کسی امام کے اقوال سمجھ کر ان) پر عمل کرے، یا یہ کہ کسی غیر معروف کتاب (پر اعتماد کرے اور اس) سے مسائل لے کر ان کی اقتدا کرنے لگے۔ چنانچہ النہر الفائق شرح کنز الدقائق میں یہ تمام تصریحات موجود ہیں۔

(باقی)

مطبوعات ذیل جو ایک مدت سے ختم تھیں چھپ چکی ہیں

مسئلہ قومیت ۔ اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر ۔ تنقیحات ۔ روداد جماعت اسلامی حصہ اول

۱۰ر عہ عہ ۸ر

ہیگل مارکس اور نظام اسلام

عہ

مولانا سندھی کے افکار وخیالات پر ایک نظر

از

مولانا مسعود عالم صاحب ندوی قیمت ۱۲ر